R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

ٹیلی فون - ۲۰
قیمت تین روپے سالانہ

جلد ۲۴ - شمارہ ۵	ایڈیٹر: آل احمد سرور	یکم فروری ۱۹۶۵ء

اداریہ

لالہ لاجپت رائے کا جنم دن

لالہ لاجپت رائے ۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء کو لدھیانے کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد اردو کے ایک استاد اور اردو فارسی کے عالم اور ادیب تھے۔ لالہ لاجپت رائے کی بھی اس زمانے کے رواج کے مطابق پہلے اردو اور فارسی میں تعلیم ہوئی۔ بعد میں اسکول اور کالج کی تعلیم ختم کرکے انھوں نے وکالت شروع کی۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ صحافی اور مصنف تھے۔ انھوں نے گیری بالڈی، سری کرشن جی، دیانند سرسوتی اور شیوا جی پر اردو میں کتابیں لکھیں۔ انھوں نے آریہ سماجی تحریک میں پرجوش حصہ لیا اور سماج سدھار اور تعلیم کے دائرے میں پنجاب کی بڑی خدمت کی۔ وہ اپنے زمانے کے بہترین مقرروں میں گنے جاتے تھے۔ وہ کانگریس کی تحریک کے شروع سے ساتھ رہے۔ سرسید کو ان کے والد نے ان کی سیاسی پالیسی کے متعلق ایک خط لکھا تھا جس کا انگریزی ترجمہ لاجپت رائے نے کیا تھا۔ لاجپت رائے چوں کہ پنجاب کے قومی رہنماؤں میں تھے اس لیے جب وہاں کسانوں میں بے چینی پھیلی تو ایک ظالم دفتر شاہی نے انھیں برما جلا وطن کر دیا جہاں سے وہ پوری قوم کے ہیرو بن کر واپس پہنچے۔ انھوں نے دو دفعہ امریکہ کا دورہ کیا اور جاپان اور انگلستان بھی گئے۔ انھوں نے انگریزی میں کئی کتابیں لکھیں جن میں سے سب سے مشہور مس میو کی مادر ہند کا جواب "دکھی ہندوستان" ہے۔ انھوں نے گوکھلے کے ادارے SERVANTS OF INDIA کے نمونے پر SERVANTS OF THE PEOPLE کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ برسوں وہ اخبار PEOPLE کے ایڈیٹر بھی رہے اور پنجاب میں قومی تحریک کی رہنمائی کرتے رہے۔ لاہور میں سائمن کمیشن کے خلاف جو جلوس نکلا اس کی قیادت انھوں نے کی اور پولیس کی لاٹھیاں کھائیں جن کی وجہ سے وہ خاصے زخمی ہوگئے۔ مگر اسی دن شام کو انھوں نے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہر لاٹھی جو ہمارے لگی ہے برطانیہ کے تابوت میں ایک کیل ہے۔ ان چوٹوں کی وجہ سے ہی ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ آج ملک کے گوشے گوشے میں ان کا سو واں جنم دن منایا جارہا ہے اور ان کے کارناموں کی یاد تازہ کی جارہی ہے۔ ہم بھی اس محب وطن، اس قومی رہنما، اس مجاہد آزادی، اس اردو کے مصنف اور مقرر کی روح کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جس نے پنجاب میں آزادی اور خدمت وطن کی تحریک کو طاقتور بنایا اور ملک کی آزادی کی جدوجہد کو تیز کیا۔

سیربین

آخر نوے سال کی عمر میں چرچل کا انتقال ہوگیا۔ چرچل کے ساتھ انگلستان ہی نہیں دنیا کی تاریخ کا ایک باب ختم ہوتا ہے۔ بلاشبہ چرچل دنیا کے بڑے لوگوں میں سے تھا جب دوسری جنگ عظیم نے

اس شمارے میں

وقع پر انگلستان کا مستقبل خاصا تاریک ہو رہا تھا اور ہٹلر کی فوجوں نے ایک ضرب میں ہالینڈ، بلجیم اور فرانس تینوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا تھا تو ایسا نظر آتا تھا کہ انگلستان بھی بچ نہ سکے گا۔ مگر چرچل کی ہمت و جرأت اس کے استقلال اور پامردی نے انگریزوں میں نیا ولولہ پیدا کیا اور بالآخر جنگ کا رخ بدل گیا۔ اس کی مشہور تقریر جس میں اس نے کہا تھا کہ میں اپنی قوم کو خون، پسینہ اور آنسو ہی دے سکتا ہوں اور میرے پاس کچھ نہیں ہے، آج بھی لوگوں کے دلوں کو گرماتی ہے۔

چرچل نے نہ صرف انگلستان کو شکست سے بچا لیا بلکہ اس نے ہٹلر کی شکست کے لیے روس اور امریکہ دونوں سے رشتہ قائم کیا اور فسطائی طاقتوں کو بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ انگلستان کے سیاسی شعور کی پختگی کی دلیل یہ ہے کہ ایسے ہیرو کو بھی جس نے لڑائی میں انھیں فتح دلائی تھی امن کے لیے وزیر اعظم بنانا انھوں نے پسند نہ کیا اور ۱۹۴۵ء میں مزدوروں کی حکومت برسر اقتدار آگئی۔

چرچل ہندوستان کی آزادی کے خلاف تھا۔ اس کا بس چلتا تو ہندوستان کو ۱۹۴۷ء میں آزادی نہ ملتی بلکہ کچھ دن اور اس کے لیے انتظار کرنا پڑتا۔ وہ برطانوی شہنشاہیت کا سب سے بڑا پشتی بان تھا، مگر اس میں اتنا ظرف تھا کہ جب ۱۹۵۰ء میں جواہر لال نہرو سے اس کی لندن میں ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے کہا کہ میں آپ کے امریکہ کے دورے میں ساتھ ہوتا تو آپ کا تعارف اس طرح کرتا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے نفرت اور خوف پر فتح حاصل کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چرچل نے ہندوستان کی آزادی کے دو رہنماؤں گاندھی اور جواہر لال نہرو کے کردار کی خوبی کا دیر میں اندازہ کیا، مگر کیا تو۔ وہ اپنے زمانے کا بہترین مقرر اور مدبر تھا۔ اس کی بحیثیت ادیب کے بھی شہرت تھی اور اسی لیے وہ نوبل انعام کا بھی مستحق سمجھا گیا۔ اس کی خود نوشت سوانح عمری انگریزی نثر کا ایک شاہکار ہے۔ چرچل ایک اچھا مصور بھی تھا۔ اس کی شخصیت اور اس کے کارناموں کا مغرب اور دنیا کی تاریخ پر نقش غیر فانی ہے۔ وہ ہمارا دوست نہ تھا، مگر ہم پھر بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے وطن کی اور انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے۔

سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو سرکل کا قیام

باوجود اس کے کہ سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اردو کے پریمیوں نے وہاں اردو سرکل کی بنیاد ڈالی ہے جس کے صدر جناب گوپال کرشن کھنہ اور سکریٹری جناب انصار شیروانی ہیں۔ اس سرکل کا خاص مقصد زبان و ادب کی اشاعت کرنا اور ہندی اور اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو ایک مرکز پر لاکر ان میں آپس میں یک جہتی پیدا کرنا ہے۔

۲۰ جنوری ۱۹۶۵ء کو اس سرکل کا افتتاحی جلسہ حضرت شہاب سروری کی صدارت میں کالج کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ آپ نے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے اردو کلچر پر ایک جامع اور مدلل تقریر فرمائی۔

اس جلسہ میں علاوہ کالج کے پروفیسران، طلباء اور طالبات کے شہر کے مخصوص شعراء کرام نے حصہ لے کر جلسہ کی زینت اور اردو سرکل کے وقار کو بڑھایا جس کے لیے ہم خاص طور سے حضرت میکش اکبرآبادی کے شکر گزار ہیں۔

اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں کالج یونین کا تعاون بھی قابل ستائش ہے۔ جناب بلبیر گوئل صدر کالج یونین نے ہر قدم پر اردو سرکل کی معاونت فرمائی اور اپنی یونین سے اردو سرکل کی مالی امداد فرما کر زبان و ادب سے اپنی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ جس کے لیے ہم ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

(سکریٹری)

گوملا کالج میں اردو طلباء سے یونیورسٹی فیس میں ۲۵ روپیے زائد لیے جا رہے ہیں

گوملا۔ ۲۰ جنوری۔ خبر ملی ہے کہ گوملا ڈگری کالج ضلع رانچی میں اردو کے خلاف اراکین کالج کا معاندانہ رویہ شدید ہو گیا ہے۔ اردو تعلیم اور اردو طلبہ کے خلاف تنگ نظری اور اردو دشمنی کے رویہ سے مجبور ہو کر ایسی ترکیبیں نکالی جا رہی ہیں کہ اردو طلبہ یا تو کالج چھوڑ دیں یا اردو کی تعلیم ہی ترک کر دیں۔ چنانچہ اردو طلبہ کے پیہم مطالبوں کے بعد بھی کالج میں اردو مضمون کا الحاق یونیورسٹی سے نہیں کیا گیا ہے۔ اور اس سال کالج کے ریگولر اردو طلبہ کو یونیورسٹی فیس کے علاوہ پچیس روپیہ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اجازت کی فیس طلب کی جا رہی ہے۔

چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ پرنسپل کے رویہ سے اردو طلبہ بہت پریشان ہیں اور کالج مذکور کے اردو طلبہ نے رانچی یونیورسٹی کے ذمہ داروں اور محکمہ تعلیم کے اعلیٰ افسران تک اس افسوسناک مطالبے سے اردو طلبہ کی گلوخلاصی کے لیے عرضداشت بھیجی ہے۔

اس سلسلہ میں کالج کے اراکین اور رانچی یونیورسٹی کے اردو دشمنی کے خلاف بہار ریاستی انجمن ترقی اردو بھی کارروائی کر رہی ہے تاکہ یونیورسٹی کے غیر آئینی رویہ سے گوملا کالج کے اردو طلبہ کو پریشان ہونے سے بچایا جا سکے۔

([illegible])

مغربی جرمنی میں آئین اکبری کا قدیم نسخہ

بون۔ ۱۲ جنوری۔ مغربی جرمنی کی لائبریریوں میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کافی مواد اور قلمی نسخے وغیرہ ہیں۔ ان میں قابل ذکر ابوالفضل کا آئین اکبری ہے۔ اس کا حاشیہ سبز رنگ کا ہے۔ اس کے شروع میں دو رنگین قلمی تصویریں اکبر و جہانگیر کی ہیں۔ ان تصویروں میں انھیں تخت پر بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر بیربل کی ہے۔ (الجمعیۃ دہلی)

الیات اشرف

"جگر کی غزلیہ شاعری"

جگر کی غزلیہ شاعری پر حال ہی میں جو کتاب "مجلس ادب و ثقافت علی گڑھ" نے شائع کی ہے۔ اس پر کئی اہم تبصرے میری نظر سے گذرے نیز "ہماری زبان" علی گڑھ مورخہ ۲۲ دسمبر ۶۴ء میں عبدالغنی صاحب کا ایک مضمون نظر سے گذرا جس کے بعض مندرجات سے مجھے پوری طرح اتفاق ہے لیکن ان کا یہ جملہ محل نظر ہے۔ کتاب کا نصف سے زائد حصہ عروضی و لسانی بحثوں پر صرف کیا گیا ہے اور بہت دور دور کی کوڑیاں لائی گئی ہیں۔ کتاب کو میں نے بار بار پڑھا اور صفحات کے اعداد و شمار بھی دیکھے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل تبصرہ نگار نے جو کہ صرف عروض (PROSODY) کے نام سے ہی خائف ہیں نصف سے زائد کتاب کو عروضی بحث پر مشتمل قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۲۰۵ صفحات پر مشتمل کتاب میں صرف ۴۸ صفحات عروضی بحث پر مشتمل ہیں۔ علم عروض (PROSODY) کا شعر و سخن سے جو تعلق ہے وہ علمائے ادب کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ درحقیقت نغمہ و آہنگ کی اساس اولین عروضی بحریں اور ان کے متوازی اوزان ہی ہیں جن پر ہمارے ادبی سرمایہ میں امیر خسرو سے لے کر آج تک کی تمام اردو شاعری پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فن جس کا موجد دوسری صدی ہجری میں خلیل بن احمد بصری گذرا ہے جس نے اس علم کو عربی زبان میں وسعت دی اور جس نے نئی بحریں تخلیق کر کے فن شاعری کے لیے نئے ساز و آہنگ تلاش کیے، نئے راستے بنائے اور اپنے ذہن رسا سے اس فن میں جدت و ندرت پیدا کی چنانچہ عربی زبان کے شعر و سخن میں دور جاہلیت کے بعد کا جتنا سرمایہ ہے وہ خلیل بن احمد بصری، ابوالبشر عمرو بن عثمان سیبویہ اور عبداللہ ابن المعتز کی وضع کردہ بحور اور اوزان پر مشتمل ہے۔ فارسی میں یہ علم عربی کے ذریعہ آیا اور اس کو شعرائے متقدمین سے لے کر آج تک کے شعراء نے برتا اور اپنے نغمہ و آہنگ کو اسی اوزان پر منضبط و مدون کیا۔ فارسی میں محمد بن قیس، نصیر الدین طوسی، رشید الدین وطواط، ابوالحسن الاخفش، مولانا یوسف نیشاپوری اور سلمان ساوجی وغیرہ نے اس علم پر اہم کتابیں لکھیں۔ لیکن ابھی حال ہی میں ایران کے مشہور اسکالر ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے اس فن پر "تحقیق انتقادی در عروض فارسی" کے نام سے ایک بہت اہم کتاب لکھی ہے جس میں مختلف اوزان شعر پر اور فن موسیقی کے رموز و نکات پر علمی انداز سے بحث کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نغمہ، راگ، راگنی اور اس کے تمام متعلق جزئیات بغیر متعین آہنگ کے اپنا کوئی علیحدہ وجود نہیں رکھتے اس لیے میری معلومات کے مطابق دنیا کے تمام ترقی یافتہ ادب مثلاً انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی اور اردو وغیرہ میں شعر و سخن کے لیے ضابطے متعین کیے گئے ہیں ہندی زبان میں بھی یہ فن موجود ہے جسے "چھند جیا" کہتے ہیں۔ عروض (PROSODY) کے بارے میں ایک مشہور نقاد نے لکھا ہے "عروض عملاً شعر کی اساس اولیں ہے جو نقاد شعر کی تنقید کے سلسلے میں عروض سے تعارض نہیں کرتے حق یہ ہے کہ شعر کی تنقید کا حق ادا نہیں کرتے۔"

علم عروض کی فنی حیثیت اور اردو ادب میں اس کی ناقابل فراموش اہمیت کو اس درجہ کم کر کے دکھانا فاضل تبصرہ نگار کی علمی ناواقفیت کی پردہ دری کرتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اب نظم و غزل کے لیے عروض (PROSODY) کی پابندی لازمی نہیں رہی ہے اور جدید ادبی رجحانات اور انگریزی ادب کے مطالعہ کے بعد سے یہ میلان اردو شاعری میں عام ہو گیا ہے کہ نظم کو ردیف، قافیہ اور اوزان و بحور کا پابند نہیں ہونا چاہیے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ہمارا تمام قدیم ترین سرمایہ جو عربی، فارسی اور اردو کی دواوین کی شکل میں موجود ہے اور جو کلیتہً عروض و قافیہ کی پابندیوں سے مزین ہے اس کی تحقیر کی جائے اور اس کو لائق اعتنا نہ سمجھا جائے۔

فاضل تبصرہ نگار تو علم عروض سے اپنی نفرت اور خفگی کا حد درجہ اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ جگر کے دشمن ازلی نیاز فتحپوری کی وہ ٹیکنیک ہے جس کی ادبی دائرہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کو ادبی دنیا نے رد کر دیا ہے۔" میری ناچیز رائے میں کسی بھی دیانت دار تبصرہ نگار کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے مشتعل جذبات کو ادبی پاروں کی کسوٹی کے وقت بروئے کار لائے۔ فاضل تبصرہ نگار کا یہ کہنا کہ علامہ نیاز فتح پوری جگر کے دشمن ازلی ہیں۔ یہ خود ادبی دیانت داری اور اصول تنقید کے لیے ایک بدنما داغ ہے۔ مجھے یہاں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے یہ الفاظ بار بار یاد آتے ہیں: "تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا، وہ انسان کا فن اور انسان کے بہترین کارناموں کے پرکھنے کا فن ہے۔ ظاہر ہے بہترین کارناموں کے پرکھنے کے لیے انتہائی دیانت اور دانشمندی اور احترام سے کام لینا پڑیگا" کاش فاضل تبصرہ نگار کی نظر ان الفاظ پر بھی پڑی ہوتی تو وہ علامہ نیاز فتح پوری کو جگر کے دشمن ازلی کہنے سے باز رہتے اور دیانت داری کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے احترام کی اس منزل کو بھی فراموش نہ کرتے جو ان جیسے منصب کے ناقد کے لیے ضروری تھی۔

علامہ نیاز فتح پوری کی علمی حیثیت اور ناقدانہ صلاحیت

کو جو لوگ جگر کی ازلی دشمنی پر محمول کرکے گرانا چاہتے ہیں ان کو علمی استدلال اختیار کرنا چاہیے نہ کہ دشمنی کا الزام دیگر اُن کی تحقیر۔ علامہ نیاز فتح پوری نے جولائی ۱۹۶۱ء میں نگار کا جگر نمبر نکالا تھا جس میں صفحہ ۱۲ سے ۵۰ تک جگر کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا تھا۔ زبان و محاورہ کی غلطیوں کی جانب اشارے کیے تھے اور از اول تا آخر لہجہ غیر جانبدارانہ، تنقید نگار کی حیثیت سے اختیار کیا تھا۔ عروضی مسائل پر بھی انھوں نے بحث کی تھی اور جگر کے کلام کے جو نقائص و معائب ان کی نظر میں آئے ان کو بحیثیت ایک نقاد کے علمی انداز سے پیش کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ فاضل تبصرہ نگار نے عروض کے متعلق یہ سمجھ کر کہ ادبی دائرہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کو ادبی دنیا نے رد کر دیا ہے، اپنی علمی نا واقفیت کا بھرم کھول دیا ہے میرے نزدیک فن عروض کی اہمیت سے انکار اپنے تمام شعری سرمائے کی تحقیر کے مترادف ہے۔

جگر کی غزلیہ شاعری پر میری نظر سے جو تبصرے گذرے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے ممتاز رسائل میں معارف اعظم گڑھ آج کل دہلی سب رس حیدرآباد اور نگار پاکستان کے گراں قدر تبصرے شامل ہیں۔

معارف کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے "اس کتاب میں ان کی شاعری اور خاص طور پر ان کی غزل گوئی پر اتنی وزنی تنقید اب تک نہیں ہوئی" ممکن ہے کہ فاضل تبصرہ نگار نے معارف کا یہ تبصرہ نہ پڑھا ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ بات اس کتاب پر تبصرہ کرنے والے موافق یا مخالف حضرات نے یک زبان ہو کر کہی ہے ماہنامہ "زندگی" رامپور کے ایڈیٹر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اس کتاب پر سرسری نظر بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ کلام جگر کی اتنی چھان بین شاید ہی کسی نے کی ہو۔ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں صنعت ایہام سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے وضاحت و صفائی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ایک عرصے کے بعد تنقید پڑھ کر پڑھنے کو ملی جس کے انداز تحریر اور مباحث میں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ نتیجہ ہے فاضل مصنف کی عربی و فارسی کی واقفیت کا۔ اردو زبان کی شاعری پر انگریزی یا مغربی اصول نقد و نظر، اصطلاحات اور اسلوب تحریر میں تنقید کرنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ خوشی ہوئی کہ یہ کتاب اس فیشن سے پاک ہے۔ فاضل ناقد کی یہ محنت و صناعت فکر انگیز اور قابل قدر ہے۔"

ایک اور تبصرہ نگار خواجہ اطہر حسین (ایم۔ اے) نے اس کتاب کے عروضی حصہ کے متعلق خاص طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے "کتاب کے چھٹے باب میں (جو آخری باب ہے)

جگر کے کلام کی عروضی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ جگر کے کلام میں جتنی عروضی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان کے متعلق صحیح رائے تو فن عروض کے ماہرین ہی قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن جب مصنف جگر کی تمام غزلوں کا جن کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے، فرداً فرداً عروضی تعیّن کرکے بتاتے ہیں کہ جگر نے کل کتنی بحریں اور کتنے اوزان استعمال کیے ہیں ـــــ ہر وزن میں انھوں نے کتنی غزلیں کہی ہیں اور پھر ان عروضی غلطیوں کی صراحت کرنے میں متعلقہ اوزان کے ساتھ اس وزن کا عروضی نام بھی دے دیتے ہیں تو عام قاری پر بھی پوری بات ضرور واضح ہو جاتی ہے۔ فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اپنی تحقیق پر پورے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کوئی دعویٰ بغیر دلیل کے نہیں ہے۔ لہٰذا صاحبان فن بخوبی ان اعتراضات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔۔۔۔ عروض (PRESODY) بھی ریاضی سے ملتی جلتی چیز ہے جہاں فیصلہ انفرادی ذوق، علم و ادب پر نہیں بلکہ ریاضی کی طرح جواب کے صحیح یا غلط ہونے پر مبنی ہوتا ہے۔ گو تھوڑے بہت اختلاف رائے کا موقع بھی آجاتا ہے مگر بہت کم ـــ اس کے علاوہ کوئی بھی صاحب فن اجازت نہیں دے گا کہ ایک ہی شعر کا ایک مصرعہ ایک بحر میں اور دوسرا کسی اور بحر میں۔ مصنف کے بیان کے مطابق اس اصول کے مطابق جگر کے کلام میں موجود ہے۔۔ ۔۔۔۔ کتاب کا یہ باب شاہد ہے کہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں علم عروض کے متعلق فاضل مصنف کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ کسی شاعر کے کلام کا عروضی جائزہ اور وہ بھی اس تفصیل کے ساتھ اسی کے بس کی بات ہے جو اس فن سے واقفیت تامہ رکھتا ہو۔ اس ضمن میں خود اعتمادی مہارت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔"

اس اقتباس سے آپ اس کتاب کی عروضی حیثیت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں فن عروض نقد شعر کا ایک اہم جزو ہے اور اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ اس لیے مصنف کا اس پر خصوصی توجہ دینا لائق تحسین ہے۔

فاضل تبصرہ نگار نے جگر کی شاعری کو سراہتے ہوئے ان کی نظموں مثلاً "ساقی سے" "یاد کا عالم" اور "قحط بنگال" وغیرہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یقیناً جگر کی یہ نظمیں بھرپور اور ادبی حیثیت سے کامیاب ہیں ان نظموں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے میں یہاں یہ اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ فاضل مصنف نے صرف جگر کی غزلیہ شاعری کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے ان کی نظم کو نہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے جگر کے تغزل اور ان کے ماحول کے بارے میں کس قدر وسیع انداز سے لکھا ہے "جگر کا تغزل غزل کا جانا پہچانا تغزل ہے۔ حالی!

غزلیں

فضا کوثری

جو ارمان فطرتِ دل ہو گئے ہیں　سخن سنجی میں شامل ہو گئے ہیں
ہمیں مجبور نا ہے دل سیرِ چمن سے　ترے جلوے مقابل ہو گئے ہیں
بھری محفل میں استفسارِ پرسش　تری نظروں کے قائل ہو گئے ہیں
لباسِ راہبر میں راہزن بھی　شریکِ کشتیِ منزل ہو گئے ہیں
جنھیں دنیا نے دیوانہ کہا ہے　تری الفت کے قائل ہو گئے ہیں
ہمارے دم سے تھی تزئینِ محفل　ہمیں تو زینِ محفل ہو گئے ہیں
بزعمِ خود ہیں "اربابِ بصیرت"　مگر صورت پہ مائل ہو گئے ہیں

فضا کچھ اس طرح محفل میں ہیں ہم
کوئی سمجھے کہ بزدل ہو گئے ہیں

واحد پریمی

صرفِ بہار آؤ جگر کا لہو کریں　اپنے چمن کو انجمنِ رنگ و بو کریں
لطفِ بہار اٹھانے سے پہلے یہ فرض ہے　جو چاک پیرہن میں انھیں ہم رفو کریں
اونچی فضا میں اڑنے سے حاصل نہیں کچھ　ذروں ہی میں ستاروں کی ہم جستجو کریں
جامِ خودی دل کو چھلکنے نہ دیں کبھی　پوری جو ہو سکے وہی ہم آرزو کریں
افسردہ کائنات ہے بے کیف زندگی　کچھ دیر آؤ تذکرۂ ماہ رو کریں
ان کی نگاہِ مست کی سرمستیاں بخیر　کیوں آرزوئے بادہ و جام و سبو کریں

تالے پڑے ہیں جبر کے جن کی زبانوں پر
واحد وہ اپنی نظروں سے ہی گفتگو کریں

ساجد پرویز

یہ بوئے گل نہ بہارِ چمن عزیز ہمیں　ہوا ہے جب سے وہ گل پیرہن عزیز ہمیں
ہمارے دم سے چراغاں ہے بزمِ زنداں　بہت ہے جلوۂ دار و رسن عزیز ہمیں
نظر میں جب سے ہے رنگِ بہارِ لالہ و گل　ہے شہرِ دل کا ہر اک سیم تن عزیز ہمیں
کہاں لذتِ زخمِ جگر یہ پوچھیے دوست　ہوئی ہے خارِ طلب کی چبھن عزیز ہمیں
ہمارے چاک گریباں پہ اے خرد مندو　نہ یوں ہنسو کہ ہے دیوانہ پن عزیز ہمیں
ہزار بار جہاں حسرتوں کا خون ہوا　نہ جانے کیوں ہے وہی انجمن عزیز ہمیں

جہاں ہے نغمۂ خسرو سے پیار اے ساجد
وہاں ہے سوزِ غمِ کوہکن عزیز ہمیں

ضیاء الحق حسیم نشتر

آج ہم زندگی کی بات کریں　یا فقط آپ ہی کی بات کریں
جو اندھیرے دل سے ٹکرائے گی　اس نئی روشنی کی بات کریں
فکرِ دار و رسن سے کیا لینا　آؤ ہم زندگی کی بات کریں
پیار و الفت کے گیت دہرائیں　خیر سے دوستی کی بات کریں

منزل لوٹے کی اے نشتر
کیوں نہ دیوانگی کی بات کریں

۶ر فروری کو جشنِ مجاز کی تیاریاں

بمبئی کے بعض نوجوان، ادیب، شعراء اور صحافیوں نے "جشنِ مجاز کمیٹی" قائم کی ہے تاکہ مجاز کے پیام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ عوام میں ادبی ذوق پیدا کیا جائے اور ان کو اپنے بہترین تہذیبی، ادبی و روحانی ورثے سے استفادہ کرنے کی تربیت دی جائے۔

"جشنِ مجاز کمیٹی" کے سکریٹری عنایت اختر ہیں اور نوجوان ادیب، شعراء اور صحافیوں کی یہ تنظیم باقاعدہ پروگرام کے تحت کام کر رہی ہے، چنانچہ ۵ر دسمبر سنہ ۱۹۶۴ء کو مجاز کی برسی کے موقع پر بمبئی کے صابو صدیق میدان میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جاں نثار اختر نے کی، اور افتتاح جگن ناتھ آزاد نے کیا اس میں ساحر لدھیانوی، نیاز حیدر، باقر مہدی، ادا سلطانپوری، مظفر شاہجہاں پوری نے کلام سنایا۔

اب اس کمیٹی کی جانب سے ۶ر فروری سنہ ۶۵ء کو بمبئی میں شاندار پیمانے پر "جشنِ مجاز" منانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ جس میں ممتاز ادیب اور فلمی شخصیتیں بھی سرگرمی سے حصہ لیں گی۔

"جشنِ مجاز" کے موقع پر مجاز کی زندگی کے متعلق ایک ڈرامہ پیش کیا جائے گا اور مجاز کی غزلوں و نظموں کو مشہور مغنی و پلے بیک سنگر پیش کریں گے مجاز کی شاعری اور شخصیت پر دو ممتاز ادیب مقالے پڑھیں گے۔ "جشنِ مجاز کمیٹی" نے اس تقریب میں، تمام ادیبوں اور ادب نواز دوستوں سے شرکت اور تعاون کی اپیل کی ہے۔ خط و کتابت کا پتہ یہ ہے۔

۱۲، یعقوب اسٹریٹ بمبئی، ۳

سید فضل الیکن

اختر شیرانی کا "رومان"

(گذشتہ سے پیوستہ)

صفحہ ۲۹ سے "تعلیمی و قلمی حصہ" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "علم بذریعۂ فلم۔ سکولوں کی تعلیم کو کس طرح آسان کیا جائے"؟ شیخ افتخار رسول بیرسٹرایٹ لا (ملتان) کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اور صفحہ ۳۱ پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں فلم کے تعلق سے تجزیہ بھی ہے۔ معلومات بھی ہے اور مشورے بھی ہیں۔ صفحہ ۳۱ ہی پر "چند اشعار" کے عنوان سے "سردار اللہ نواز خاں نواز بی۔ اے (آنرز)" کی غزل ہے۔ غزل کے اشعار کی تعداد ۶ ہے۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہے۔

وہ مجنوں ہوں حریم شش جہت بھی مجھ کو زنداں ہو
خوشا گر وسعتِ صحرا بہ اندازِ جنوں ہوتی
سنائی ہی نہیں بلبل کی خونیں داستانیں سنے
وگرنہ ہر رگِ گل دردِ دل سے جوئے خوں ہوتی

صفحہ ۳۲ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "نوجوان بت تراش کی آرزو" اختر شیرانی کی مشہور نظم ہے۔

صفحہ ۳۳ سے "سیر و سیاحت" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "جاپان کی آزاد فضا میں"۔ "جاپان کے دلچسپ حالات" حضرت خضر تمیمی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل (چنیوٹ) کے نوٹ کے ساتھ ان کے نام لکھے گئے "میاں نذیر احمد بی۔ اے خلف حافظ خدا بخش صاحب صغیر (چنیوٹ)، اسلامیہ کالج لاہور" کا وہ خط شائع ہوا ہے۔ جو خاصہ معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ اس خط کا اختتام صفحہ ۴۴ پر ہوا ہے۔ آخر میں "نذیر احمد" لکھا ہے۔

صفحہ ۴۴ ہی پر "ایک مسافر کی صدا" (لیڈی اردن اسکول (شملہ) کے سامنے!)" مظہر عزیز (الہ آباد)" کی ۱۵ اشعار پر مشتمل ایک نظم ہے۔

صفحہ ۴۵ سے "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "گورِ غریباں" کے عنوان سے "خان صاحب شیخ عالم علی۔ بی۔ سی۔ ایس سپرنٹنڈنٹ جیل (فیروزپور) کی نظم شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۴۸ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ نظم ۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے اور دوسرے بند کے اشعار کی تعداد ۵ ہے۔ تیسرے بند کے اشعار کی تعداد ۱۹ ہے۔ چوتھے اور پانچویں بند کے اشعار کی تعداد ۶ ہے چھٹے بند کے اشعار کی تعداد ۱۰ ہے اور ساتویں بند کے اشعار کی تعداد ۱۱ ہے اس نظم سے متعلق بعنوان "تعارف" اختر شیرانی کی رائے نقل کی جا چکی ہے۔

صفحہ ۴۸ ہی پر "باغ میں" کے عنوان سے "بالم ڈاچی والا" کا ایک مختصر سا نثر پارہ ہے۔

صفحہ ۴۹ سے "دیہاتی معاشرت" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "تارو" (ایک دیہاتی رومان)۔ "ڈاکٹر سید صدیق حسین نجمی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ پی۔ سی۔ ایم۔ ایس (لاہور) شروع ہوتا ہے یہ افسانہ صفحہ ۵۰ پر ختم ہوا ہے۔ اس کے متعلق بعنوان "تعارف" اختر شیرانی کا اظہار رائے نقل کیا جا چکا ہے۔

صفحہ ۵۰ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "آمد بہار" (بہاریہ) "مستورہ" کے نام سے ایک نظم ہے۔ اشعار کی تعداد ۵ ہے۔ یہ نظم زبان حال سے "تخیل اختر" کی ترجمان ہے۔ اس کے متعلق اختر شیرانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی "تعارف" کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔

صفحہ ۵۸ سے "پاگل خانے کے فلسفی کا روزنامچہ شروع ہوتا ہے۔ یہ روزنامچہ "شبیر حسین۔ بی۔ اے۔ تحصیلدار (جھنگ)" کا افسانہ ہے۔ اس افسانہ کی بابت بھی اختر شیرانی کا اظہار خیال نقل کیا جا چکا ہے۔ یہ افسانہ صفحہ ٦٦ پر ختم ہوتا ہے آخر میں "باقی" لکھا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ یہ پہلی قسط ہے۔

صفحہ ٦٦ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "ایک خط کے جواب میں" (نظم) "مسٹر ایس۔ ایم۔ اکرام ایم۔ اے۔ آئی۔ سی۔ ایس (سورت)" کی نظم ہے۔ اس نظم کے چار بند ہیں اور ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ نظم کے آخر میں سنہ ۱۹۲۹ء تحریر ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ یہ سنہ ۱۹۲۹ء کی تخلیق ہے۔

صفحہ ٦٨ سے "افسانہ" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "ایک رومانی شام" (اخذ و ترجمہ) م۔ ع۔ عمر فاروق۔ ایم۔ اے۔ سابق ایڈیٹر "غزال" کا افسانہ شروع ہوتا ہے۔ یہ افسانہ صفحہ ۷۲ پر ختم ہوا ہے۔

صفحہ ۷۲ پر "غزلیات شیراز" کے عنوان سے اس ذیل سرخی (غزل) مولانا مرتضیٰ احمد خان چیف ایڈیٹر روزنامہ "احسان" کی فارسی غزل ہے۔ اشعار کی کل تعداد ۷ ہے اور مطلع و مقطع یہ ہے:

گوشم از دیار یار پیغامے رسید آخر
سر و چشم از ریاضِ بخت گلہائے شنید آخر

زفرط ناز در عنائی تا آں می نمود اوّل
تا بیاموزیت ام را او بہ الطافے خرید آخر

اس غزل کے آخر میں ۱۵ اگست ۱۹۳۶ء تحریر ہے۔ اس غزل سے متعلق "تعارف" کے ذیل میں اختر شیرانی کی عبارت نقل کی جا چکی ہے۔

صفحہ ۷۹ سے "مسلسل افسانہ" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "تیرسیس" مسٹر خلیل احمد بی۔ اے کا ترجمہ افسانہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۸۲ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ افسانہ مسلسل ہے اور دوسری قسط پر آخر میں "باقی" لکھا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اقساط ابھی باقی ہیں۔

صفحہ ۸۳ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں "تصورِ سرافیل" کے عنوان سے (اپنے عزیز دوست ماثر کے نام) جناب شمس شیدائی سہسرامی۔ بی۔ اے (آنرز) صدر "بزم ابوالکلام کلکتہ" کی نظم ہے۔ اس نظم کے اشعار کی تعداد ۱۷ ہے

صفحہ ۸۴ سے "مسلسل ڈراما" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "زندہ لاش" (طالسطائی کے ایک ڈرامہ کی بنا پر)۔ مسٹر خلیل احمد بی۔ اے (صحافی) کا ڈرامہ شروع ہوتا ہے اور میرے پیش نظر "رومان" کے صفحات ۸۴۔ ۸۵۔ اور ۸۶ پر مشتمل ہے۔ فہرست دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صفحہ ۸۸ پر ختم ہوا ہے۔

میرے پیش نظر "رومان" صفحات ۸۶ پر مشتمل ہے فہرست کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ پیش نظر شمارے کے صفحات کی تعداد ۹۰ ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ میرے پیش نظر شمارے سے صفحات ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹ اور ۹۰ غائب ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان غائب شدہ صفحات کی تفصیلات پر روشنی ڈالیں تو کرم ہوگا۔

اردو روسی مصور لغت

ماسکو ۲ر جنوری:۔ اردو اور روسی زبانوں کے ماہروں کی مدد سے ایک اردو روسی لغت تیار کی گئی ہے جو تقریباً ۴۰ ہزار اردو روسی الفاظ اور ان کے معانی و مطالب پر مشتمل ہے۔ اس لغت میں مطالب کی وضاحت کے لیے متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔ (دعوت دہلی)

ہند و پاک کے ممتاز ترین شاعر اقبال

برصغیر ہند و پاک کے ممتاز شاعر محمد اقبال (۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۸ء) نے آبادی کے بہت بڑے حصہ میں نو آبادیت دشمن اور سامراج مخالف جذبات پیدا کرنے میں زبردست کردار انجام دیا ہے اس فلسفی شاعر نے غلام ملکوں کے عوام کو اپنے وطن کی دولت کا خود مالک بننے کا پیغام دیا۔ آج بھی ان کی تصانیف کی روح تازہ ہے۔ یہ باتیں "محمد اقبال اور ان کی فارسی شاعری" نامی کتاب میں کہی گئی ہیں۔ جسے تاجکستان کی سائنس اکاڈمی شائع کر رہی ہے۔

یہ کتاب نوجوان تاجکستانی سائنس داں عبد اللہ غفوروف کی ہندوستان سے واپسی کے بعد تیسری بڑی تصنیف ہے جہاں انھوں نے ہندوستانی ادب سے متعلق اپنا مطالعہ مکمل کیا۔ اس سے پہلے وہ مرزا غالب اور میر تقی میر پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔

کتاب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے جو ہندوستان میں اکتوبر انقلاب کا خیر مقدم کرنے والے پہلے لوگوں میں تھے سوویٹ عوام سے دوستانہ تعلقات کے فروغ کا پیغام دیا تھا۔

اس ممتاز ہندوستانی شاعر کا کلام تاجکستان میں بے انتہا مقبول ہے اور اسے بے حد سراہا جاتا ہے۔ تاجک زبان میں ان کی نظموں کے مجموعے شاعری کے رسیا ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ (افکار بھوپال)

مغربی پاکستان میں انگریزی کی جگہ اردو

کراچی مغربی پاکستان اسمبلی کی جس سلیکٹ کمیٹی کے سپرد قومی زبان کا بل کر دیا گیا تھا اس نے انگریزی کی جگہ اردو کو سرکاری دفاتر، عدالتوں اور تعلیمی اداروں میں جولائی ۱۹۶۸ء تک مکمل طور پر رائج کرنے کی سفارش کی ہے۔ (قومی آواز لکھنؤ)

مراسلات

نادانی یا جی حضوری

"ہماری زبان" میں نئے سال کے پہلے ہی نمبر میں بسم اللہ ہی غلط۔ وہ بھی ایک چھوڑ دو دو جگہوں پر۔ صفحہ ۱ پر نیز صفحہ ۱۱ پر پھر وہی بات دہرائی گئی کہ آندھرا پردیش میں اردو دوسری علاقائی زبان ہے۔ ایک فرماں بردار اخبار حکومت کی ہمنوائی کرے تو قابلِ معافی ہے کیوں کہ یوں بھی اس کی ترقی میں موانع ہی نہیں "موانعات" ہیں، حیرت پروفیسر شیروانی صاحب پر ہوتی ہے کہ وہ غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھ رہے ہیں، نہ معلوم یہ نافہمی ہے یا خوش فہمی؟

اصل سوال یہ ہے کہ آندھرا پردیش میں اردو کو دوسری علاقائی زبان کا درجہ دے دیا گیا اور اس کو دوسری علاقائی زبان ہونے کا درجہ یا موقف حاصل ہو چکا یا صرف اس کے متعلق مبہم سا، ذو معنی یا نہ اور تاویلی امکانوں سے سرشار اعلان شایع کیا گیا، جس کو قطعی طور پر قانون کا کوئی درجہ حاصل نہیں میں یہ بات ماننے کے لیے بھی تیار ہوں کہ آندھرا پردیش کے بعض عہدیدار چاہتے تھے، چاہتے ہیں یا چاہتے ہوں گے کہ اردو یہاں کی دوسری علاقائی زبان ہو جائے مگر ہے، ہونا چاہیے، ہونا چاہیے تھا یا ہوگا میں بہت فرق ہے۔

میں نہ بیرسٹر ہوں، نہ قانون داں ہوں، نہ عالم سیاسیات ہوں، نہ ماہر آئین و دستور ہوں، نہ مورخ ہوں۔ البتہ میں نے حیدرآبادی ہونے کے ناتے اردو سے متعلق اعلان غور سے پڑھے ہیں۔ عمرانی علوم سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہے اصطلاحیات اور لغت نویسی سے بھی ناواقف نہیں۔ اس لیے میں صاف صاف کہہ سکتا ہوں کہ حکومت کی طرف سے شایع شدہ یا حکومت سے وابستہ افراد کے اعلانوں اور بیانوں کو کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں۔ عدالتِ عالیہ حیدرآباد کے ایک سابق جج اور کئی قانون داں افراد میرے ہم خیال ہیں۔ محض کسی سرکاری جریدہ میں ایک مصلحت آمیز بات یا نیم پسندیدہ اعلان شایع کرنے سے اسے قانون کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا۔ کسی قانون سے کیا حیثیت ہے اور اس کو قانون کا درجہ یا موقف حاصل ہونے کے لیے جو مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں، انھیں اخبار والے نہ سمجھنا چاہیں یا نہ سمجھ سکیں تو اور بات ہے البتہ شیروانی صاحب جیسے قانون داں اور قانون ساز ضرور جانتے ہیں پھر بھی وہ ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھیں تو اکبر کے لفظوں میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

بنائے ملت بگڑ رہی ہے، [illegible]
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں

(ڈاکٹر جعفر حسن)

اردو مجلس

"ہماری زبان" کے ۲۲؍ دسمبر کے شمارہ میں اردو مجلس کے عنوان سے آپ کا اداریہ پڑھا۔ ایک اردو مجلس ہی کیا حقیقت تو یہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سے متعلق پالیسی حد درجہ ناقص ہے اردو خبروں کا جو بلیٹن نشر ہوتا ہے اس میں اردو کم ہندی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ کبھی "استھیاں"، "پردھان"، "داہ سنسکار" جیسے الفاظ اور کبھی "تال میل بنائے رکھنے" والے وزیر، چھوٹے وزیر، "راشٹرپتی" اور "اپ راشٹرپتی" جیسی اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو ظاہر ہے ہم اسے اردو تو نہیں کہہ سکتے۔ جب اس قسم کے الفاظ و تراکیب استعمال کیے جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ اردو کا یہ لفظ یا وہ لفظ ہندی یا انگریزی کے اس لفظ یا اُس لفظ کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کیا آل انڈیا ریڈیو کا ہندی ترجمہ "آکاش وانی" ہے؟ آکاش وانی کا مطلب تو الہام ہوتا ہے۔

اردو مجلس کے علاوہ دلی اے سے اردو کا ہفتہ وار پروگرام منگل کی رات کے ساڑھے نو بجے نشر ہوتا ہے۔ یہ بھی محض نام کا پروگرام ہے۔ افادی پہلو اس میں بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

موازنہ مقصود نہیں، لیکن مجھے اس بات پر سخت اعتراض ہے کہ جب پنڈت نہرو پر شری پرکاش جی انگریزی میں یا ڈاکٹر دنادھر یادھیکاری ہندی میں تقریر کریں یا ہندی کوی نوین جی پر ہندی میں فیچر نشر ہو تو اسے نیشنل پروگرام کا نام دیا جائے اور تمام اسٹیشنوں سے ریلے ہو۔ لیکن جب خواجہ غلام السیدین صاحب یا ڈاکٹر سید عابد حسین مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر اور جناب انصار ہروانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے جنم دن پر تقریر کریں تو اسے صرف دلی اے یا اردو مجلس میں نشر کرنا ہی کافی سمجھا جائے۔ آخر اردو ایک قومی زبان، ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد ہمارے قومی ہیرو، پھر ان پر نیشنل پروگرام کیوں پیش نہیں کیا جاتا؟

اس سلسلے میں اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن فی الحال اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ جس محکمہ کا قلمدان وزارت پنڈت نہرو کی لائق صاحبزادی مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں ہو اس میں اردو کی یہ حالت قابلِ افسوس ہے۔

"مشاعروں کا موسم" کے عنوان سے آپ کا اداریہ اور اس کے بعد دو تین حضرات کے مراسلات دیکھ چکا ہوں۔ سامعین شعرا اور منتظمین کے "حقوق و فرائض" پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اپنی طرف سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے اکثر بڑے (بلحاظ عمر) شاعروں کے ساتھ کچھ چمچے بیٹھے تم

سے شاعر لگے رہتے ہیں۔ مشاعرے میں پورا گروپ ایک ساتھ بیٹھتا ہے۔ پارٹی کے ہر شاعر کے ہر ایک سیدھے شعر پر ہنگامہ خیز داد دی جاتی ہے اور دوسرے شاعروں کو یوں نظر انداز کیا جاتا ہے جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہیں۔ بزرگوں کو یہ زیب نہیں دیتا۔ ایسے نوجوان شاعروں کی مناسب حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جو بقول شخصے خود لکھتے اور خود پڑھتے ہیں۔

بہار کے ایک اہم شہر میں مشاعرہ منعقد تھا۔ کچھ لوگ اپنے گروپ کے شاعروں کو خواہ مخواہ چمکانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامعین میں سے کسی منچلے نے کہا اب شعر ہم لوگ بھی سمجھنے لگے ہیں۔ اور پھر تو ہوٹنگ کا وہ بازار گرم ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔ اس ذہنیت کا توڑ کرنا بہت ضروری ہے۔ مصرعہ اٹھانے کی رسم پھر سے جاری کرنا بھی لازمی ہے۔

(اختر سلیم سہسرام)

اردو میڈیم والے بچوں کی فیس کی معافی

جمشید پور۔۔۔۔ ایک مستند اطلاع کے مطابق پتہ چلا ہے کہ کریمیہ ٹرسٹ جمشید پور کے ٹرسٹی جناب ایس۔ ایم شفیق نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ بچے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اگر وہ اردو میڈیم میں سرکاری نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کی کل فیس معاف کر دی جائے گی ایسے بچوں کے سرپرست سنٹرل کریمیہ پرائمری اسکول سنٹرل کریمیہ مڈل اسکول یا سینٹرل کریمیہ ہائی اسکول میں اپنے بچوں کا داخلہ کرائیں۔ جناب شفیق صاحب نے جو اسکول ہذا کے سکریٹری بھی ہیں مزید بتایا کہ اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے غیر اردو داں طبقہ کی ہمت افزائی کے لیے یہ اقدام کیا گیا ہے ایسے بچوں کی فیس کی معافی کے علاوہ ان کو کتابوں کی سہولت بھی دی جائے گی مزید برآں اپنے کلاس میں اول آنے والے ہونہار لڑکے اور لڑکیوں کو "کریمیہ اسکالرشپ" بھی دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ رعائتیں صرف ان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور جو اردو میڈیم میں پڑھنا چاہتے ہیں یاد رہے مذکورہ تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور سرکاری نصاب کے مطابق ہندی اور انگریزی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے یہاں ۵ رجولائی سے میٹرک تک طلبا اور طالبات دونوں کی تعلیم کا بہترین انتظام ہے۔

غیر اردو داں حلقوں میں خاص طور پر اس جرأت مندانہ اقدام کی تعریف کی جا رہی ہے اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کا ذکر ہوتا جاتا ہے۔ (الجمعیۃ دلی)

روسی زبان کے مطالعہ کا ادارہ جولائی سے کام شروع ہو جائے گا

نئی دہلی۔ ۲۰ رجنوری۔۔۔۔۔ روسی زبان کے مطالعہ کا مجوزہ انسٹی ٹیوٹ جولائی میں کام شروع کر دے گا۔ اس ادارہ کا تعلق مجوزہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے رہے گا۔ جولائی ۱۹۶۹ء میں تین سالہ ڈگری کورس شروع ہو جائے گا اس ادارہ میں روسی زبان سے ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کا شعبہ ہوگا۔

(الجمعیۃ دلی)

اردو کے تحفظ کا وعدہ

میسور کے سابق کانگریسی وزیر مسٹر ٹی سبرامنیا جو کچھ عرصہ قبل کانگریس سے علیحدہ ہو کر مخالف پارٹیوں (جن میں مسلم لیگ، متحدہ سوشلسٹ پارٹی، سوتنتر پارٹی اور ڈی ایم کے بھی شامل ہے) کا متحدہ محاذ پوراسیمتی کے نام سے قائم کر چکے اور بنگلور کارپوریشن کے حالیہ الکشن میں کانگریسی اقتدار کا جو ۱۹۳۳ء سے برابر چلا آ رہا تھا، خاتمہ کر چکے ہیں۔ انھوں نے بنگلور کے ایک جلسۂ عام میں جو کامیابی کی خوشی میں منعقد ہوا تھا۔ تقریر کرتے ہوئے اردو زبان کا خاص طور سے ذکر کیا اور کہا کہ اردو ہندوستان کی ۱۴ زبانوں میں سے ایک ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس زبان کو جو ملک کے قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، نظر انداز کر سکے۔

ہمیں امید ہے کہ بنگلور کارپوریشن اردو کے حق میں ان کے اس ارشاد کو صحیح ثابت کر کے دکھائے گی۔

(سیاست جدید کانپور)

ایس ایس شرما کو صدمہ

میں انتہائی افسوس کے ساتھ تمام قارئین کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۶۹ء کو رات کے ایک بجے جناب ایس۔ ایس شرما صاحب (اردو ٹیچر) کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ محترم پرنسپل صاحب نے جلسۂ تعزیت کے بعد فوراً اسکول بند کر دیا۔ جناب شرما صاحب جبرائز انڈمان میں اردو کے سب سے بڑے علم بردار ہیں خدا سے دعا ہے کہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ (تصدق رادھانہ ہٹ بلیر)

ادارۂ یادگار دبیر کا قیام

لکھنؤ۔ اردو کے عظیم مرثیہ گو مرزا دبیر کی یادگار قائم کرنے کے لیے جلسہ زیر صدارت شری مہابیر پرشاد سریواستو (سابق وزیر صحت اترپردیش) پرنس سلطان حسن مرزا کے مکان پر ۱۵ر جنوری کی صبح ہوا جس میں ادارہ یادگار دبیر کے نام سے ایک ادارہ کا قیام عمل میں آیا۔ (قومی آواز لکھنؤ)

اقبال کے تجربات جگر کی شاعری میں ڈھونڈھنے کی گنجائش نہیں جگر جس ماحول اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ داغ، امیر اللہ تسلیم اور رسا کا ماحول ہے "بیزدہ" آتش گل "کے دیباچہ میں لکھے ہیں جگر کی مقبولیت اور شہرت کو عام طور سے نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے تغزل، ان کی زندی و سرمستی، ان کے لطیف اشارات و دلچسپ کنایات، ان کی حسن پرستی اور حسن کاری سے کسی کو انکار نہیں۔

جگر بلاشبہ بعض غزلیں اور اکثر اشعار نہایت دل پذیر اور پر لطف کہے ہیں ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی زندگی ملتی ہے جو ان کے سوز دروں کی پروردہ ہے۔ ان کا کلام جوش و سرمستی سے معمور ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے صحیح لکھا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ جگر کا انداز بیان بڑا تیکھا اور پیارا ہے بلکہ ان کے کلام کی پہلی اپیل شاید طرز ادا ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔

جگر کے یہ اشعار کس قدر جان دار اور معنی خیز ہیں۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کے چمن کی روٹھی بہار اب بھی

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

"زمانۂ قدیم میں ہندستان"

ماسکو میں "زمانۂ قدیم میں ہندوستان" کے زیر عنوان مضامین کا ایک نیا مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔ اس سے سوویت ماہرین علم الہند کی مختلف النوع دلچسپیاں اور ہندوستان کے بارے میں گہرا اشتیاق ظاہر ہوتا ہے۔ ان مضامین میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ، سیاسی نظام، مادی اور روحانی تہذیب، فلسفیانہ و مذہبی تصورات کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ لسانیاتی، زبان و ادب کے مسئلوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔

سوویت ماہرین علم الہند کی تصنیفات سے سوویت عوام کی دلچسپیاں روز افزوں ہیں۔ اس میں منظر عام پر آنے والا نیا مجموعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

جامی کی شاہکار تخلیق دریافت
مختی چیونٹی اور چڑیا کی حکایت

سوویت یونین کے نوجوان محقق میخائل زاند نے فارسی کے شہرۂ آفاق شاعر عبدالرحمٰن جامی کی ایک گمشدہ منظوم تخلیق "مختی چیونٹی اور چڑیا" دریافت کی ہے۔ یہ ایک حکایت ہے۔ جو دری آنا اکادمی آف اورینٹل لینگویجز کی طرف سے شائع کردہ "فارسی نظموں کا مجموعہ" میں شامل تھی۔ مرتب کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ مگر اس نے اس انتخاب میں "بہارستان" کے کئی ٹکڑے بھی شامل کیے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گمنام مرتب نے مذکورہ نظم کا اطالوی زبان میں ترجمہ مع فارسی اصل کے محفوظ کیا ہے۔ عبدالرحمٰن جامی کی ۵۵۰ ویں سالگرہ میں شرکت کرنے والے ماہرین و عالم اس دریافت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

جواب استفسار

(۱)

اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

مندرجہ بالا شعر کے متعلق نثار احمد فاروقی صاحب جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کس کا شعر ہے؟ اُن سے اطلاعاً عرض ہے کہ یہ شعر خواجہ حیدر علی آتش کا ہے۔

اس شعر کے بارے میں مسٹر ایم۔ اے۔ خان کا استفسار "ہماری زبان" ۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا جس کا جواب حبیب الحکیم صاحب نے یکم فروری ۱۹۶۳ء میں دیا تھا کہ یہ شعر آتش مرحوم کا نہیں، بلکہ ان کے شاگرد اصغر صاحب کا ہے۔ میں نے یہ شعر شتیلا سہائے راز کانپوری کی کتاب "گلہائے شگفتہ" میں صفحہ نمبر ۱ پر پڑھا ہے۔ انھوں نے یہ آتش مرحوم کے شعروں میں درج کیا ہے۔ (مس عطیقہ شیخ سرینگر)

(۲)

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

یہ شعر حضرت فراق گورکھپوری کا ہے (ظفر احمد نظامی)

(۳)

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

مندرجہ بالا شعر کے بارے میں جناب چندر دیپ صاحب نے پوچھا ہے (ہماری زبان شمارہ یکم جنوری ۱۹۶۵ء) کہ یہ شعر کس کا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ شعر حضرت فراق گورکھپوری کا ہے۔

(رحمٰن جامی)

ہندی کی سمسیا

۲۶ جنوری سے ہندی کو عملی طور پر بھارت کی راج بھاشا کا درجہ مل جائے گا۔ مرکزی حکومت کے قریباً سبھی کام ہندی میں ہوں گے۔ "قریباً" اس لیے کہتا ہوں کہ اس کے بعد بھی انگریزی موجود رہیگی۔ اس کے دو کارن ہیں۔ ایک یہ کہ ہندی میں ابھی تک ایسے ٹکنیکی، قانونی اور انتظامی شبد عام طور پر موجود نہیں جن سے حکومت کو بار بار واسطہ پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں لازمی ہوگا کہ انگریزی کا سہارا لیا جائے۔ دوسرا کارن یہ ہے کہ حکومت کے زیادہ تر بڑے افسر ہندی صرف نہ جاننے کے برابر جانتے ہیں۔ بازار میں چیزیں خریدتے وقت یا گھر میں ان ملازموں کے ساتھ جو ہندی کے سوائے دوسری بھاشا نہیں جانتے وہ ٹوٹی پھوٹی ہندی بول کے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ لیکن سرکاری کام چلانے کے لیے جس ہندی کی ضرورت ہے اس کا گیان انھیں ہے نہیں۔ اُن کے پاس ہندی میں جو کاغذات آئیں گے تو ساتھ ہی انگریزی ترجمہ بھی آئے گا۔ صرف ترجمہ وہ پڑھیں گے۔ اصل خط کو دیکھیں گے نہیں۔ اسی طرح مرکزی حکومت صوبائی سرکاروں سے خط و کتابت کرے گی تو کہنے بھیجنے کو ہندی میں کرے گی۔ لیکن ساتھ ہی ہر خط کا انگریزی یا صوبائی بھاشا میں ترجمہ بھی بھیجے گی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوبائی افسر بھی ترجمہ ہی پڑھیں گے۔ اصل خط کو دیکھیں گے نہیں۔

یہ حالت بہت خوشگوار نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی ذی ہوش آدمی اس بات سے انکار تو نہیں کرسکتا کہ یہ تبدیلی ضروری تھی۔ آج کی ہندی شبدوں کے معاملہ میں بہت زوردار اور امیر بھاشا ہے ایسا تو کوئی کہہ نہیں سکتا۔ اصلیت یہ ہے کہ جس ہندی کو آج ہم اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ کبھی ملک کی عام بول چال کی بھاشا تھی نہیں۔ عام بول چال کی بھاشا وہ تھی اور اب بھی ہے جس میں اردو ہندی کے درمیان کوئی فرق نہیں رہتا اور جسے گاندھی جی بجا طور پر ہندی یا ہندستانی کہتے تھے۔ جس بھاشا کو آج ہم اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اس متعصب فرقہ پرستی کی بھاشا تھی جو مسلمانوں کی مخالفت کرنا چاہتی تھی۔ اور مسلمانوں کی مخالفت کے کارن اردو کا ہندستانی میں پرچلت عربی و فارسی شبدوں کا بائیکاٹ کرنا چاہتی تھی۔ "کھشور کرم کاریالیہ" اور "کیش کرتن مندر" آج سے ۳۰ برس پہلے بھی استعمال ہوتے تھے لیکن عام لوگ تو اُسے "حجام" یا "نائی کی دکان" ہی کہتے تھے۔ اس متعصبانہ ذہنیت کو بھاشا کا آدھار بنایا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ بہت آسانی سے ابھرتی نہیں۔ اس ذہنیت کی وجہ سے اچھے بھلے چالو شبدوں کی جگہ سنسکرت کے کٹھن شبد ہندی میں بھرے گئے۔ عربی و فارسی کے پرچلت شبدوں کے ساتھ ساتھ انگریزی کے پرچلت شبدوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہونے لگا۔ ایک ایسی بھاشا جاگ اٹھی جسے سمجھنا اُن لوگوں کے لیے بھی کٹھن ہوگیا جو اچھی بھلی ہندی جانتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہندی کو صحیح معنوں میں راج بھاشا بنانا کٹھن معلوم ہو اور آگے راج بھاشا بنانے کے بعد بھی انگریزی کا سہارا لینا پڑے تو یہ مجبوری کی بات ہے لیکن مجبوریوں کے باوجود دیش کی ایکتا کا تقاضا ہے کہ ہندی کو راج بھاشا کے روپ میں شروع کیا جائے۔ جوں جوں ہم اُسے استعمال کریں گے توں توں وہ سہل بنے گی اس کا شبد کوش بڑھے گا۔ اور یہ شبد کوش ایسا ہوگا جسے عام لوگ سمجھ پائیں گے۔ انگریزوں نے اس ملک کے نظم و نسق کو سنبھالا تو سو برس تک وہ اردو اور فارسی کو راج بھاشا بنا کر اپنا کام چلاتے رہے ۱۸۳۵ء میں انھوں نے انگریزی کو راج بھاشا بنانے کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے پر مکمل طور سے عمل کرانے میں انھیں پچاس برس لگ گئے۔ اس سے پہلے بھارت کے ہندو راجہ اور پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ فارسی میں ہی اپنا کام چلاتے رہے۔ اصلیت یہ ہے کہ راج بھاشا کو بدلنا بہت آسان نہیں ہوتا۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ ہندی کے معاملے میں بھی یہ وقت لگے تو ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے۔

لیکن ہندی کی سمسیا یہ ہے کہ جہاں ایک طرف ہندی کے حامی حکومت پر اس لیے برس رہے ہیں کہ وہ ۲۶ جنوری کے بعد بھی ہندی کے ساتھ ساتھ انگریزی کو کیوں جاری رکھنا چاہتی ہے۔ انگریزی کا مکمل طور پر بائیکاٹ کیوں نہیں کرتی اور اُسے دیش نکالا کیوں نہیں دیتی، وہاں ہندی کے مخالف اس لیے حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس نے اس ادھورے طریقے پر بھی ہندی کو راج بھاشا بنانے کی کوشش کیوں کی چنانچہ پچھلے روز شری راجگوپال آچاریہ نے "تروچی" کے اندر "آل پارٹیز اینٹی ہندی کانفرنس" میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "بھارت سرکار نے جو قدم اٹھایا ہے اسے ہم کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ ہم پر جس ہندی امپیریلزم کو ٹھونسنے کی کوشش ہو رہی ہے ہم اس کے سامنے کسی حالت میں سر نہیں جھکائیں گے۔ اس زبردستی کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ بھارت سرکار کا دعویٰ ہے کہ اس نے ہندوستان کو ایک رکھنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اس قدم سے یہ ملک چند ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔" ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف ہماچل پردیش، پنجاب، دہلی، راجستھان، یو۔پی، مدھیہ پردیش

اور بہار رہ جائیں گے۔ کشمیر، گجرات، مہاراشٹر، گوا، میسور، کیرل مدراس، آندھرا، اڑیسہ، بنگال، آسام، تری پورہ، منی پور، اور انڈمان کے چودہ علاقے الگ الگ دیش بن جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں درشٹی کون اس تعصب پر مبنی ہیں جو ایک جمہوری دیش میں بہت دیر چل نہیں سکتا۔ پہلے تو اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔

اس دیش کو اگر ایک رہنا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی کوئی ایک سانجھی بھاشا ہو۔ اور یہ بھاشا کوئی ہندوستانی بھاشا ہو، سات سمندر پار کے لوگوں کی بھاشا نہیں۔ یہ بھاشا صرف ہندی ہو سکتی ہے جسے ملک کے لوگوں کی عظیم اکثریت سمجھتی ہے کوئی دوسری بھاشا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہندی کو لوگوں پر زبردستی ٹھونسا نہ جائے۔ جو لوگ ہندی نہیں جانتے ان کے لیے زندگی کو دشوار نہ بنایا جائے بلکہ دھیرے دھیرے اس بھاشا کو دیش بھر کی راج بھاشا بنایا جائے — لوگوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اسے سیکھ سکیں اور اپنا سکیں آخر یہ بات ہوگی ضرور۔ اُتاولے پن سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے خرابی آئے گی۔

(اداریہ ملاپ، دہلی مورخہ ۲۲ جنوری)

بزم ادب مالیر کوٹلہ

بزم ادب مالیر کوٹلہ کی مجلس عاملہ کا ایک ہنگامی اجلاس دارالکمال میں زیر صدارت حضرت مولانا کمال الدین صاحب کمال منعقد ہوا، جس میں شہر کے اردو دوستوں نے کافی تعداد میں شرکت فرمائی اور اس اجلاس میں سال رواں کے لیے مندرجہ ذیل عہدیداران منتخب ہوئے۔

صدر: علامہ کمال الدین صاحب کمال۔
نائب صدر: حکیم عبدالحمید خاں صاحب فرحت
جنرل سکریٹری: نور محمد صاحب فاروقی
سکریٹری: اخلاق احمد چوہان (جرنلسٹ)
مجلس عاملہ:
خزانچی: گیان چند صاحب خیال (جرنلسٹ)
(۱) عبدالرشید قریشی صاحب اثر (۲) شام لعل صاحب گوئل (۳) شوکت فردوسی صاحب (جرنلسٹ) (۴) شمشاد حسرت صاحب (۵) پریم کمار صاحب پریم سود (۶) انوار احمد خاں صاحب تشنہ ادیب

(اخلاق احمد پروپیگنڈہ سکریٹری)

نیلور میں ابر احسنی گنوری کی آمد

۱۹ جنوری کی شب انجمن ترقی اردو (نیلور) کی جانب سے جناب علامہ ابر احسنی گنوری کی صدارت میں ایک عظیم مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ صدر محترم نے اپنی ابتدائی تقریر میں کہا کہ اردو دیگر زبانوں کی بہ نسبت ہندوستان کی سب سے زیادہ سرمایہ دار زبان ہے۔ یہ زبان قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہے۔ آج حالات نے جہاں ہمیں اردو کے تحفظ کے لیے کوشاں ہونے پر مجبور کر دیا ہے وہیں ہمیں اس کی ترقی و اشاعت سے بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے
مشاعرہ میں یوسف شمیم بی۔ اے۔، واحد نیلوری، ڈاکٹر ناز ابردی، انور، اثر، قہر، اعظم، شیدا، زہری، حافظ اشہر اور تسنیم ایم۔ اے نے شرکت کی۔

(عبدالوہاب تسنیم ایم۔ اے سکریٹری)

اردو داں روسی انجینیر بھوپال میں

بھوپال۔ بھلائی میں کام کرنے والے اردو داں روسی انجینیر مرزا خاں مرزائیف نے بھوپال کے ادیبوں اور شعراء سے ملاقات کر کے ہند اور روس کے درمیان دوستی کے تعلقات کو مضبوط بنانے پر زور دیا۔ یہ ملاقات مسٹر ایم عرفان کے مکان پر ہوئی جس میں مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ مرزا ازبکستان کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے تاشقند یونیورسٹی میں اردو کا ڈپلوما حاصل کیا ہے۔

(افکار بھوپال)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا، اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا۔